دھندلی تحریر

یٰسین احمد

17-2-1159/2، واحد کالونی، انڈیا فنکشن ہال لین، یاقوت پورہ، حیدرآباد، موبائل:09848642909

دادا جی بیمار تھے۔

یوں تو دادا جی کئی برسوں سے بیمار چلے آرہے تھے، لیکن اس بیماری کی وجہ سے نہ بستر پکڑا نہ روزمرہ کے کاموں کو چھوڑا اور نہ اپنے ضروری فرائض سے منہ موڑا۔ حواس خمسہ تعطل کا شکار نہیں ہوئے۔ یادداشت، بصارت، سماعت حسب معمول کام کررہی تھی۔ یہاں تک کہ قوت سامعہ بھی غضب کی تھی۔

اُس دن میں دادا جی کے قریب بیٹھا ہوا تھا۔ وہ آنکھیں بند کئے مجھ سے گفتگو کررہے تھے۔ اتنے میں میری بہن کی جواں بیٹی خوشبو کا طوفاں لیے کمرے میں داخل ہوئی۔ دادا جی نے آنکھیں نہیں کھولیں اُس کی طرف دیکھا بھی نہیں نرم لہجے میں کہا۔ ''بیٹی! جوان لڑکیوں کو ایسی تیز خوشبو کا استعمال نہیں کرنا چاہئے۔ اسی تیز خوشبو کی خاطر گلی کے سانپ باہر نکلتے ہیں۔''

معلوم نہیں میری بھانجی نے گلی کے سانپ کا کیا مطلب نکالا، مگر وہ الٹے قدموں سے باہر نکل گئی تھی۔ دادا جی کی باتیں ایسی ہی ہوتی تھیں۔ غور سے سننا پڑتا تھا۔ سوچنا پڑتا تھا۔ دھیان دینا پڑتا تھا۔ تعلیمی دور میں مجھ کو دادا جی کی باتیں سمجھ میں نہیں آتی تھیں، لیکن جب سے دادا جی کا لاڈلا بنا ان کی باتیں آسانی سے سمجھ میں آنے لگیں۔

پیرانہ سالی ہمہ قسم کی بیماریوں کا منبع بن جاتی ہے، لیکن شکر ہے کہ دادا جی کسی مہلک مرض سے کوسوں دور تھے۔ زکام، سردی، ہلکا پھلکا موسمی بخار، سر کا درد، جوڑوں کا درد کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ پیرانہ سالی کے باوجود دادا جی چاق چوبند تھے۔ فعال تھے۔ فجر، مغرب اور عشا کی نماز عموماً گھر میں ہی پڑھتے، لیکن ظہر اور عصر کی نماز مسجد میں ادا کرتے کہ دن روشن رہتا ہے اور فضا میں خنکی بھی نہیں رہتی۔

اُن کی عمر کیا تھی؟ میں کیا، خاندان کا کوئی بھی فرد ان کی تاریخ پیدائش سے ناواقف تھا۔ دادا جی جس زمانہ میں پیدا ہوئے تھے اُس زمانے میں پیدائشی صداقت ناموں کا چلن نہیں تھا۔ جب تاریخ پیدائش کہیں درج کرنا ہوتی تو حافظہ کی بنیاد پر قمری تاریخ لکھ دیتے یا پھر عیسوی تاریخوں کو کام میں لاتے۔ قیاس ہے کہ دادا جی کی عمر ۷۵ یا ۸۰ کے درمیان ہوگی۔ کیونکہ میرے والد کی عمر ۵۲، ۵۳ سال سے تجاوز کرچکی تھی۔

میں سمجھتا ہوں کہ اُن کی صحت کا راز اُن کی فعالیت تھی، نیک نیتی تھی، کھلی ذہنیت تھی، نرم دلی تھی، ہمدردانہ فطرت تھی جو گھر والوں تک محدود نہیں بلکہ خاندان پڑوس اور ہر ملنے جلنے والوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ کسی کے دکھ درد سن کر جذباتی ہوجاتے۔ فوراً آگے پیچھے کچھ سوچے بغیر ہمدردی پر اُتر آتے۔ نتائج کی پروا کئے بغیر۔

برسوں پہلے کی بات ہے ظہر کی نماز پڑھ کر نکلے تو مسجد سے باہر ایک بندے پر نظر پڑی، جو غم زدہ، پریشان اور بے چین نظر آرہا تھا۔ قریب جا کر وجہ پوچھی۔ پوچھنے کا انداز اتنا ہمدردانہ تھا کہ وہ کچھ چھپا نہ سکا۔ جھٹ بتایا کہ وہ کرناٹک کے کسی گاؤں سے بھاگ کر آیا ہے۔ مجبور ہوکر چوری کی ہے۔ پولیس اُس کی تلاش میں ہے۔ دو دن سے بھوکا ہے۔ دادا جی نے پہلے اُس سے وعدہ لیا کہ آئندہ چوری نہیں کرے گا۔ اُس نے توبہ کرلی۔ کان پکڑ کر وعدہ کیا۔ دادا جی اُس کو گھر پر لے آئے۔ گھر میں رکھا۔ سارے گھر نے مخالفت کی پر دادا جی نے کسی کی نہ سنی۔ اُس کا نام اپا راؤ تھا۔ مسجد سے باہر اس لیے کھڑا تھا کہ لوگ اُس کو مسلمان سمجھیں۔ دادا جی نے کئی دنوں تک اُس کو نوکروں کے کوارٹر میں رکھا، کھلایا پلایا، ڈرائیونگ سکھائی۔ ایک پرائیویٹ کمپنی میں ملازمت دلائی۔ آج اپا راؤ ایک عدد بیوی اور دو بچوں کے ساتھ شریفانہ زندگی گزار رہا ہے۔ ہفتے میں دو ایک مرتبہ جب بھی فرصت ملتی دادا جی کے پاس سلام کے لیے حاضر ہوجاتا۔ دادا جی کی برسوں پرانی فیٹ کو چمکاتا اور اگر ضرورت ہو تو دادا جی کو فارم ہاؤس لے جاتا۔

شہر سے ۶۰۔۶۲ کلو میٹر دور دادا جی نے ایک فارم ہاؤس بنایا تھا۔ پہلے اس فارم ہاؤس میں دھان بویا جاتا تھا اب دھان اگانا بند کردیا۔ آج وہاں انجیر، آم، امرود، فالسہ اور پپیتا کے درخت نظر آتے

ہیں۔سبزیاں بھی اُگائی جاتی ہیں ایسی سبزیاں جو بازار میں عنقا ہیں یا شاذونادر نظر آتی ہے۔جو دادا جی کو پسند ہیں۔جیسے قرفہ، کمرک (ایک ترش پھل جو سبزی بھی ہے)، شلجم اور کمرونڈے۔ان تمام باتوں کے باوجود دادا جی کی زندگی مجھ کو کئی پردوں میں ملفوف نظر آتی ہے۔کوئی کچھ نہیں بتاتا۔ کسی سے دریافت کرنے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی۔اُن کی زندگی ایسے اسکیچ کی طرح نظر آتی جس کو پنسل یا کوئلہ سے بنایا گیا ہے یکدم رگوں کی دل کشی سے محروم بے کیف، بے کشش اور غیر دلچسپ۔اس گھر کی طرح لگتی ہے جو مدتوں سے خالی پڑا ہے۔کوئی مکیں نہیں، کوئی شور و پکار نہیں۔

دادا جی کی ازدواجی زندگی بہت مختصر رہی۔یہی سات آٹھ برس پر محیط۔ابا چھوٹے تھے اور چچا بھی۔پھوپی ماں تو دو ڈھائی سال کی تھیں۔دادی جی اچانک چل بسی تھیں۔اُن کی موت طبعی تھی یا پھر کوئی حادثہ؟ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔دادی جی کی موت ایک راز تھی، ایک معمہ تھی جس کی اصلیت سے شاید دادا جی ہی واقف تھے۔ان کی موت کے بعد دادا جی نے دوسری شادی نہیں کی۔اپنی ازدواجی زندگی تینوں بچوں کی پرورش کی نذر کردی۔

اسی بیماری کے دوران دادا جی کو وصیت لکھنے کا خیال آیا۔ابا کو اپنے کمرے میں بلایا، چچا کو بلایا۔پھوپی ماں کو بھی بلایا۔میں ان کے کمرے میں موجود تھا۔اُٹھ کر جانے لگا تو دادا جی اشارے سے بیٹھنے کے لیے کہا اور بولا۔''تم بھی اس خاندان کے بالغ افراد میں شامل ہو۔''

میں بیٹھ گیا۔کچھ دیر خاموشی رہی اور پھر وہ بولے۔''اتوار کو وکیل صاحب کو بلانا میں وصیت لکھوانا چاہتا ہوں۔''

''اس کی کیا ضرورت ہے۔'' بے ساختہ ابا کے منھ سے نکلا۔پھوپی کی آنکھیں ڈبڈبانے لگیں۔دادا جی ہنستے ہوئے بولے۔''فوراً مرنے کا میرا کوئی پروگرام نہیں، مگر یہ کام ہوجائے تو اچھا ہے۔''

دُنیا میں تین قسم کی 'ضدیں' بہت مشہور ہیں۔یعنی راج ہٹ، ناری ہٹ اور بال ہٹ۔میرے بس میں ہوتا تو اس میں تھوڑا اضافہ کردیتا۔یعنی دادا جی ہٹ۔دادا جی کے من میں جو بات آتی اسے پورا کئے بغیر نہیں رہتے۔اس لیے سب کو خاموش ہونا پڑا تھا۔

رات کے کھانے سے فارغ ہوتے ہی دادا جی سونے کے عادی نہیں تھے۔کھانے سے فارغ ہوکر کچھ دیر ٹہلتے، ہم لوگوں سے گفتگو کرتے۔ٹی وی دیکھتے یا پھر کوئی کتاب اٹھالیتے۔اُس دن ٹی وی دیکھ رہے تھے ٹی وی پر ایک دردناک منظر دکھایا جارہا تھا۔ایک غریب مجبور آدمی کی بیوی دواخانے میں دم توڑ دیتی ہے۔انتظامیہ نے اُس کی لاش لے جانے کے لیے ایمبولنس دینے سے انکار کردیا۔غریب آدمی اپنی بیوی کی لاش کو کندھے پر اٹھا کر اپنے گاؤں لے جارہا ہے۔ہر کوئی دیکھ رہا ہے۔اُس منظر کو اپنے موبائل میں قید کررہا ہے تاکہ گوگل پر دکھا سکیں، فیس بک پر دکھا سکے لیکن کوئی بھی اُس کی مدد کرنے کے لیے آگے نہیں آرہا تھا۔اس منظر کو دیکھ کر دادا جی مضطرب ہوگئے۔عمر نے کچھ زیادہ ہی حساس بنادیا تھا بے چین ہوکر ہم سے بولے:

''ہم لوگ کتنے بے حس ہوگئے ہیں ایک جانور کاٹا جاتا ہے تو شہر میں کرفیو لگ جاتا ہے، لیکن ایک غریب آدمی کی مدد کرنے کے لیے کوئی آگے نہیں بڑھتا۔''

دادا جی فوراً ٹی وی کے سامنے سے ہٹ گئے اور اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔جاتے جاتے مجھ کو آنے کا اشارہ کیا۔کمرے میں تکیے کے نیچے سے چابیوں کا گچھا نکال کر مجھے دیا اور کہا۔''میری الماری کے سیف لاکر میں دستاویزات ہیں تمام نکال لاؤ۔''

الماری کے سیف لاکر میں پلاسٹک کے فولڈر میں کئی دستاویزات بہت ہی احتیاط سے رکھی ہوئی تھیں۔میں ایک ایک کرکے دستاویزات نکال رہا تھا کہ اتنے میں کسی فولڈر کے بیچ سے نکل کر ایک لفافہ فرش پر گرا۔لفافے پر دادا جی کا نام تھا اور لکھنے والی ایک خاتون تھی شبانہ خاتون۔

ایک خاتون کا نام پڑھ کر مجھ کو تشویش ہوئی۔میں نے وہیں کھڑے کھڑے لفافہ کھولا۔القاب پڑھ کر میں چونک گیا۔''میرے سرتاج....''

میں نے فوراً خط لفافے میں رکھ دیا۔آگے پڑھنا بداخلاقی تھی۔ ویسے بھی خط اتنا پرانا تھا کہ تحریر دھندلا گئی تھی، لفظ پھیل گئے تھے، اُن پر پانی کے نشان تھے یا آنسوؤں کے۔میں نے سوچا نہیں فوراً خط لفافے میں رکھ دیا اور لفافہ الماری میں۔مَیں دادا جی کی نگاہوں کی زد میں تھا۔لفافہ احتیاط سے سیف میں لاکر میں رکھ دیا، دستاویزات کے فولڈر دادا جی کو لاکر دیے اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ذہن میں کئی خیالات ابھرنے لگے۔شبانہ کون ہوسکتی ہیں؟۔کیا رشتہ کیا تعلق رہا ہوگا دادا جی سے۔شبانہ میری دادی کا نام نہیں تھا۔دیر تک سوچنے کے بعد بھی کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔

اتوار کے دن صبح صبح اپا راؤ آگیا۔دادا جی نے اُس کو فون کیا تھا۔ فارم ہاؤس جارہے تھے۔مجھ کو بھی ساتھ چلنے کا حکم ہوا۔میں ٹالنا چاہتا تھا کیونکہ فیٹ مجھ کو پسند نہیں تھی۔جسم سمیٹ کر سکڑ کر بیٹھنا پڑتا تھا، لیکن دادا جی کی ضد کے آگے کس کی چلی تھی جو میری چلتی۔اپا راؤ نے فیٹ کا کواڑ نکال لیا۔فیٹ پر جمے گرد و غبار کو صاف کیا۔بڑا سا لنچ باکس فیٹ میں رکھ دیا گیا اور ہم فارم ہاؤس جانے کے لیے نکل گئے۔

فارم ہاؤس میں تازگی اور شادابی قابل دید تھی۔ گزشتہ شب اچھی خاصی بارش ہوئی تھی جس کی وجہ سے دھلے دھلے درخت، ہرے ہرے پتوں پر رُکی بارش کی بوندیں، ٹھنڈی ٹھنڈی گھاس پر چلنے پر دل گداز احساس فرحت بخش تھا۔ دادا جی دیر تک فارم ہاؤس میں گھومتے رہے وہاں کام کرنے والوں سے باتیں کرتے رہے۔ سب اُن کی مرضی کے مطابق چل رہا تھا۔

دوپہر ہوئی دادا جی نے ظہر کی نماز ادا کی۔ پھر لنچ باکس کھولا۔ ہم نے لنچ لیا اپا راؤ نے بھی ہمارا ساتھ دیا۔ اُس وقت تک فارم ہاؤس میں کام کرنے والوں نے کئی ٹوکرے تازہ پھلوں اور سبزیوں کے ہماری کار میں رکھ دیے تھے۔ دادا جی نے ایک قدیم ملازم سے پوچھا۔ ''اس گاؤں میں ایک قبرستان ہوا کرتا تھا، اب وہ باقی ہے؟''

ملازم نے جواب دیا۔ ''صاب! اس قبرستان کی حالت بدل گئی ہے کیونکہ گاؤں کی آبادی بڑھ گئی ہے۔ الیکشن سے پہلے اوقاف والوں نے قبرستان کے اطراف احاطہ بھی بنا دیا ہے۔''

دادا جی بیمار تھے۔ وصیت کے کاغذات بھی وکیل کے حوالے کر دیے تھے۔ اب قبرستان جا رہے تھے۔ یہ سب کیا ہے۔ ایسے وہ کیوں کر رہے ہیں۔ میرے دماغ میں خیالات کی یلغار تھی۔ فارم ہاؤس کے پودوں سے کچھ پھول اور کلیاں اپنے ہاتھوں سے توڑیں اور قبرستان کی طرف روانہ ہو گئے۔ قبرستان فارم ہاؤس سے متصل نہیں تھا۔ انھیں مخالف سمت میں گاؤں کی آبادی سے دور جانا پڑا۔ وہ کار سے اُترے۔ مجھ کو آنے کے لیے نہیں کہا۔ میں خود اُن کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ بارش کی وجہ سے قبرستان میں جگہ جگہ گیلی مٹی، کیچڑ اور چھوٹے چھوٹے گڑھے پانی سے بھرے ہوئے نظر آئے۔ ان سب سے بچتے بچاتے دادا جی آگے بڑھے، ایک قبر کے قریب پہنچ کر رُک گئے۔ میں نے نہیں پوچھا کہ وہ کس کی تربت ہے اور نہ انھوں نے کچھ بتایا۔

پہلے تربت پر گل افشانی کی۔ پھر آنکھیں بند کر کے دُعائے مغفرت کرنے لگے۔ میری متوحش نگاہیں قبر کا طواف کر رہی تھیں۔ قبر پرانی تھی، زمین دوز ہوتے ہوتے رہ گئی تھی۔ کتبہ بھی قبر کے سرہانے کی زمین سے رشتہ توڑ رہا تھا۔ جگہ جگہ سے ٹوٹ چکا تھا۔ تاہم میری نگاہیں کتبہ کی دھندلی تحریر پڑھنے میں کامیاب ہو گئیں۔ کتبہ پر شبانہ بیگم لکھا تھا۔ یہی نام میں نے دادا جی کی الماری سے ملے ہوئے خط میں پڑھا تھا۔ میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ دادی کی پُراسرار موت کا کچھ کچھ راز سمجھ میں آ رہا تھا۔

دادا جی خاموشی سے قبرستان سے باہر نکلے۔ اپا راؤ نے کار اسٹارٹ کی۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر دادا جی نے آنکھیں موند لیں۔ وہ سوگوار تھے۔ جیسے ابھی ابھی کسی کو دفنا کر قبرستان سے نکلے ہوں۔ میرے ذہن نے از خود ایک مثلث بنا دیا تھا۔ دادی ماں.... شبانہ بیگم اور دادا جی، آج اس مثلث کو کوئی معنی دینے کا کیا فائدہ...؟

○○

سائنس کے منتخب مضامین

اس کتاب کے مصنف محمد خلیل بنیادی طور پر ایک سائنس داں۔ انھوں نے طویل عرصے تک مرکزی حکومت کے زیر انتظام شائع ہونے والے میگزین ''سائنس کی دنیا'' کی ادارت کی ہے۔ وہ اس بات سے بڑی حد تک واقف ہیں کہ بچوں کے لیے کس طرح کے سائنسی مضامین پیش کریں۔ اس کتاب میں انھوں نے سادہ اور سہل انداز میں بچوں کو سائنس کی باتیں بتائیں ہیں اور انھیں یہ سمجھایا ہے کہ سائنس کوئی مشکل موضوع نہیں ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے ان موضوعات کو منتخب کیا ہے جو ہمارے اردگرد بکھرے ہوتے ہیں اور باتوں باتوں میں بچوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ سائنس کی ترقیات نے انسانی زندگی پر بڑا مثبت اثر ڈالا ہے اور انسانی زندگی کے اکثر شعبے سائنس کے اثرات سے خالی نہیں ہے۔ اس کتاب میں شامل بعض مضامین ایسے ہیں جو بچوں کے ساتھ بڑوں کی توجہ بھی اپنی جانب مبذول کریں گے۔

مصنف: محمد خلیل

صفحات: ۸۰، قیمت: تیس روپے

ناشر: اردو اکادمی، دہلی